محمد حسن رجبی

اسلامی انقلاب سے قبل ایران کا سیاسی ماحول اور امام خمینیؒ (۱۹۴۱ء سے ۱۹۶۱ تک)

ایران سے رضا خاں کے فرار کے بعد پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایرانی عوام کے لیے ظالم وجلاّد صفت بادشاہ کا زوال ایک بڑی بات تھی۔ اگرچہ ظلم و استبداد کی جڑیں اپنی جگہ پر موجود تھیں البتہ اس کا ظاہری رنگ و روپ بدل گیا تھا اور ایران کا وہی حال تھا جو ۱۸۷۰ء میں نپولین سوم کے زوال کے بعد جرمنی کا ہوا تھا۔ دونوں صورتِ حال میں ظالم حکمرانوں کے زوال کے بعد ملک کے اقتدار کی باگ ڈور بیگانہ طاقتوں کے ہاتھ میں چلی گئی لیکن دونوں کے عوام محض اس لیے خوش تھے کہ انھیں ظالم حکمراں کے شر سے نجات حاصل ہوگئی۔(۱) اس خوشی کا یہ عالم تھا کہ ان لوگوں نے دوسری غاصب طاقت کی موجودگی کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور ایک لمبی مدت تک اس غاصبانہ طاقت کے خلاف کوئی آواز بھی نہ اُبھری۔

ملک کے نئے وزیر اعظم محمد علی فروغی نے بالکل اسی طرح جیسے سولہ سال قبل اپنی مخصوص تقریر کے ذریعہ رضا خاں کی حکومت کو سرکاری حیثیت سے تسلیم کروانے میں کلیدی کردار انجام دیا تھا، اس بار پھر اپنی سرگرمیاں تیز کردیں اور امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین کے خفیہ معاہدہ اور محمد رضا (۲) کی حکومت کے سلسلے میں ان تینوں ملکوں کی موافقت و رضامندی کے ساتھ محمد علی فروغی نے پارلیمنٹ کے اجلاس میں رضا خاں کا استعفیٰ پڑھ کر سنایا اور

اس کے فوراً بعد نئے بادشاہ محمد رضا کی داخلی سیاست کا اجمالی خاکہ خود اس کی زبان میں پیش کردیا۔ محمد علی فروغی نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ نیا بادشاہ ملک کے آئین کے مطابق حکومت کرے گا۔ اور سابقہ حکومت کے دوران کیے گئے مظالم کے سلسلے میں لازمی تحقیق کی جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ ایرانی عوام اپنے لباس کے انتخاب اور اپنے مذہبی فرائض کو انجام دینے کے لیے پوری طرح آزاد ہوں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی اعلان کیا گیا کہ سابقہ حکومت کے دوران ظلم کرنے والوں کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے گی اور مجرموں کو مناسب سزا دی جائے گی۔(۳)

رضا خاں کی غلامی میں لگے ہوئے افسران، مسلط کردہ سفارشی اراکین پارلیمنٹ (۴) اور برطانیہ کے مقرر کردہ اعلیٰ ایرانی حکام (۵) دیکھتے ہی دیکھتے آزادی طلب اور انقلابی بن گئے اور سابقہ دورِ حکومت کے ظالمانہ کاناموں کی مذمت کرتے ہوئے نئے بادشاہ اور فروغی حکومت کی شان میں قصیدہ پڑھنے لگے۔ اس مکر فریب کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نئی حکومت ایرانی عوام کے غیظ وغضب سے محفوظ رہے، نئی حکومت کو عوام کا اعتماد حاصل ہوجائے اور سابقہ شاہی نظامِ حکومت پوری طرح درہم برہم نہ ہونے پائے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ سیاسی قیدیوں کو آزاد کردیا گیا۔ مذہبی اجتماعات اور دوسری تمام تقریبات کے سلسلے میں پوری چھوٹ دے دی گئی۔ اخبار اور کتابوں کی اشاعت پر لگائی گئی پابندی ختم کردی گئی اور ایرانی عوام کو اپنے خیالات کے اظہار کی آزادی حاصل ہوگئی۔ لوگ اپنے گھروں اور عمومی جلسوں کے درمیان اپنے نظریات کا اعلان کرسکتے تھے۔ اور اب انھیں اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ کوئی ان کے خلاف جاسوسی کر رہا ہوگا۔ ایرانی خواتین اسلامی حجاب کے ساتھ شہر کی سڑکوں اور بازاروں میں آنے جانے کے لیے پوری طرح آزاد تھیں۔ سابقہ حکومت کے دوران شاہ اور اس کے افسروں نے جن کسانوں اور زمینداروں کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا، وہ عدالت کے سامنے لازمی اسناد و مدارک پیش کر کے اپنی زمین دوبارہ

حاصل کرسکتے تھے۔ بعض وہ افراد جن پر زیادہ مظالم کیے گئے تھے یا جن کے رشتہ داروں کو قید خانہ میں قتل کردیا گیا تھا، وہ مجرم افسروں کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کے لیے آزاد ہوگئے۔ سابقہ دورِ حکومت کے کچھ شناختہ شدہ قاتلوں مثلاً قید خانہ میں قیدیوں کو زہریلے انجکشن کے ذریعہ ہلاک کرنے والے ڈاکٹر احمدی جیسے لوگوں کے خلاف اعلانیہ مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ اسی طرح سابقہ حکومت کے پولیس چیف مختاری کو بھی گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد اسے قید خانہ سے رہا کردیا گیا۔ اس سلسلے میں خود محمد رضا شاہ نے مداخلت کی اور اپنے ذاتی بجٹ سے اس کے لیے وظیفہ بھی مقرر کیا۔(۶) مختصر یہ کہ معدودے چند افراد کے علاوہ سابقہ حکومت کے ظالم افسروں کے خلاف کوئی مؤثر قدم نہ اُٹھایا گیا اور انھیں کسی طرح کی کوئی سزا نہ دی گئی بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی دولت وثروت اور خصوصی اختیار و اقتدار کے مالک بنے رہے اور ان میں سے کچھ لوگوں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوراً ہی اپنا چہرہ بدل لیا اور موجودہ حکومت میں بھی خصوصی ظالموں کی حمایت و طرفداری سے عوام ہرگز راضی نہ تھے لیکن اس کٹھ پتلی حکومت سے اور کیا امید کی جاسکتی تھی۔ درحقیقت اگر عوام میں پھیلی ہوئی ناراضگی اور ان کے غم وغصہ کو کم کرنا مقصود نہ ہوتا تو وہ دو تین ظالموں کے خلاف بھی کوئی عدالتی کارروائی نہ کی گئی ہوتی ورنہ اگر ظالموں اور قاتلوں کے خلاف واقعاً کوئی عدالتی اقدام مقصود ہوتا تو سب سے پہلے رضا خاں کے خلاف مقدمہ قائم کر کے اسے عبرت انگیز سزا دی جانی چاہیے تھی۔ اس کے بعد ظالم و خائن وزیروں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کو ان کی حقانیت اور مجرمانہ حرکتوں کے لیے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرنا چاہیے تھا۔ اور اس کے بعد فوج، پولیس اور انتظامیہ کے دیگر اعلیٰ افسروں کو ان کی مجرمانہ حرکتوں کی سزا دی جانی چاہیے تھی لیکن یہ کام فقط اب تک انصاف پسند انقلابی حکومت سے ہی متوقع تھا۔ آخر بڑی طاقتوں کی حمایت وسرپرستی کے سایہ میں برسر اقتدار آنے والی حکومت سے یہ اُمید کیسے کی جاسکتی تھی کیونکہ اس کا اصل مقصد تو سابقہ حکومت کی کرتوتوں پر پردہ ڈالنا تھا۔(۷)

درحقیقت ہمارا مقصد محض اس کے دور کے سیاسی حالات و واقعات کا تذکرہ و تجزیہ نہیں ہے بلکہ ان حوادث کی طرف اجمالی توجہ کے ذریعہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ امام خمینیؒ نے اپنے بیانات میں ان شرمناک اور مہلک واقعات کی طرف جو اشارے کیے ہیں ان سے آپ بھی حضرات بخوبی واقف و آگاہ رہیں۔

جیسا ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ فروغی کی حکومت کا مقصد عوام کو وقتی اور ظاہری آزادی فراہم کر کے ملک میں شاہی نظامِ حکومت کے خلاف رونما ہونے والے سیاسی، سماجی اور عوامی انقلاب کی روک تھام کرنا تھا۔ اسی وجہ سے رضا خاں کے زوال کے بعد حکومت ایران نے برطانوی سامراج کے خلاف سرگرم جہاد، مذہبی رہنما آیت اللہ کاشانی کو گرفتار کرلیا تھا اور انھیں ۲۸ مہینوں تک قید خانہ میں اس بنیاد پر بند رکھا کہ وہ جرمنی کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ درحقیقت آیت اللہ کاشانی کی گرفتاری کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ ملک میں رونما ہونے والی سیاسی صورتحال کو سامراج دشمن اغراض و مقاصد کے لیے استعمال نہ کرسکیں۔(۸) لیکن جیسا کہ امید کی جاتی تھی کہ رضا خاں کے زوال کے ابتدائی ایام سے لے کر ۲۸ مرداد ۱۳۳۲ ھ ش کی فوجی بغاوت تک ۱۲ سال کی مدت کے دوران مختلف سیاسی پارٹیاں اور گروہ و جماعت اُبھر کر سامنے آئیں۔ ان پارٹیوں کے اغراض و مقاصد میں اختلاف پایا جاتا تھا کیونکہ ان میں سے زیادہ تر کسی نہ کسی خارجی طاقت سے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر وابستہ تھیں۔(۹) بالکل اسی طرح ملک میں مختلف افکار و اعتقاد کی ترجمانی کرنے والے اخبارات اور سیاسی و تنقیدی رسالوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔(۱۰) مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ سابقہ حکومت کے مقابلے میں موجودہ حکومت کی طرف سے فراہم کی گئی آزادی اور رضا خاں کے زوال کی وجہ سے ملک میں سیاسی آگہی و بیداری کی فضا ہموار ہوگئی اور اسی سیاسی بیداری کے ذریعہ آنے والے وقت میں قومی اور سامراج مخالف تحریکوں کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا کیونکہ بین الاقوامی سیاسی ماحول بھی ان تحریکوں کی ترقی کے لیے بہت مناسب

تھا لیکن ان قومی تحریکوں کی شروعات ان کی ترقی اور ان کے آخری انجام کا تجزیہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ایران کے سیاسی اور اقتصادی حالات کا اجمالی خاکہ بھی پیش کردیا جائے تاکہ قارئین کو یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہ ہو کہ اس وقت ایرانی عوام کیسے سیاسی اور اقتصادی حالات سے دوچار تھے۔

ایران میں اتحادی گروہ کی آمد کی وجہ سے اس ملک کو ناپسندیدہ اقتصادی نتائج کا سامنا کرنا پڑا۔ اس اتحادی جماعت کو ایران میں خوردنی اشیاء، ایندھن، سڑک، ریلوے لائن اور مخابراتی و ابلاغی وسائل کی سخت ضرورت تھی تاکہ لازمی جنگی وسائل اور دیگر امدادی اشیاء کو ایران کے راستہ روسی محاذ کی پشت تک آسانی سے پہنچا سکیں۔ اسی وجہ سے اس اتحادی جماعت میں شامل حکومتوں نے ایران کو عملی طور پر اس بات کے لیے آمادہ کرلیا کہ وہ ان اقتصادی منابع و مآخذ کو ان کے حوالے کردے۔ اس اقدام کا فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ایرانی روپیہ کی قیمت میں غیر معمولی کمی آگئی اور اس کے مقابلے میں برطانوی اور روسی روپیہ کی قیمت کئی گنا بڑھ گئی۔ پہلے ہی مرحلہ میں ایرانی روپیہ کی قیمت سو فیصد سے زیادہ کم ہوگئی یعنی زرمبادلہ قانون کے مطابق ایک اسٹرلنگ کی قیمت ۶۸ ریال سے بڑھ کر ۱۴۰ ہوگئی۔ اس بھاری کمی کی وجہ سے اتحادی گروہ کو آدھی قیمت پر سارا سامان اور ملازمین ملنے لگے اور جنگ کے خاتمہ کے بعد ان لوگوں نے دوگنی قیمت پر اپنا سامان ایران کے ہاتھ فروخت کردیا۔ ملکی روپیہ کی قیمت میں کمی کی وجہ سے ایران کی برآمداتی آمدنی اور درآمداتی ادائیگی کے درمیان کوئی توازن باقی نہ رہ گیا اور ملک میں گرانی بڑھتی چلی گئی اور اس طرح ایران کے غریب و مفلس عوام اور زیادہ غریب وفقیر ہوتے چلے گئے۔ ملک میں کرنسی کی فراہمی میں چار گنا اضافہ ہوگیا جس کی وجہ سے مہنگائی اور بڑھ گئی۔ اس کے علاوہ الگ الگ باہمی معاہدوں کے بموجب برطانیہ کو بیچے گئے تجارتی مال کی ۶۰ فیصد اور روس کو فراہم کیے گئے تجارتی مال کی سو فیصد رقم کی ادائیگی جنگ کے خاتمہ تک کے لیے ملتوی ہوگئی۔ اس وقت کم شدہ زرمبادلہ قیمت کے مطابق

ریال کے بدلہ میں سونا دیا جاتا تھا۔

مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایرانی عوام کے درمیان ناراضگی اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور جدید ترین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے والی خبروں نیز بعض اراکین پارلیمنٹ کے حقیقی بیانوں کی وجہ سے ایرانی عوام کے درمیان قدرے سیاسی بیداری نظر آرہی تھی۔ یہ اراکین پارلیمنٹ وقتاً فوقتاً اپنے مخلصانہ بیانات کے ذریعہ لوگوں کو برطانوی سامراج کے شرمناک مقاصد اور اس کی کرتوتوں سے باخبر رکھتے تھے اور ایرانی عوام کی یہ سیاسی بیداری آنے والے وقت میں ایران میں رونما ہونے والی ایک قومی تحریک کا بنیادی سبب بنی۔

ایرانی پارلیمنٹ کے سولہویں دور کے لیے ہونے والا عام چناؤ نسبتاً آزاد ماحول میں انجام پذیر ہوا تھا جس کی وجہ سے پارلیمنٹ میں کچھ ایسے افراد بھی پہنچ گئے جو ایرانی عوام کے حقیقی نمائندے تھے اور پارلیمنٹ میں قومی اور عوامی مفاد و مصالح کے علاوہ دوسری کسی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان حقیقی عوامی نمائندوں میں آیت اللہ کاشانی اور ڈاکٹر محمد صادق کا نام سرفہرست تھا۔ آیت اللہ کاشانی انقلاب اسلامی عراق کی راہ میں اہم اور نمایاں کردار والے نامور مذہبی رہنماؤں میں سے ایک تھے اور اس انقلاب کی ناکامی کے چنگل سے جان بچا کر ایران چلے آئے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں رضا خاں کے زوال کے بعد سے لے کر ۱۹۴۹ء تک انھوں نے ایرانی عوام کے درمیان اپنی انقلابی اور مجاہدانہ سرگرمیاں جاری رکھیں یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء کے پارلیمانی چناؤ کے دوران وہ پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوگئے۔ اس مدت کے دوران انھیں کئی مرتبہ گرفتاری، قید بامشقت اور جلاوطنی کی سزا بھی بھگتنی پڑی اور جس وقت وہ تہران سے ممبر پارلیمنٹ چنے گئے اس وقت وہ لبنان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اس چناؤ کے بعد ایرانی حکومت انھیں دوبارہ ایران واپس بلانے کے لیے مجبور ہوگئی۔ چنانچہ ایرانی عوام نے تہران میں ان کا شاندار اور یادگاری استقبال کیا اور انھوں نے دوبارہ اپنی انقلابی سرگرمیاں شروع کردیں۔(۱۱) ان کے علاوہ ڈاکٹر مصدق بھی ایران کی نامور سیاسی شخصیت تھے جو

رضاخاں کے اقتدار کے ابتدائی دور میں اس کے نزدیکی مشاورین میں شامل تھے لیکن کچھ ہی دنوں میں انھوں نے رضاخاں سے علیحدگی اختیار کرلی اور آیت اللہ مدرس کے ساتھ مل کر شاہی حکومت کی بدعنوانیوں کے خلاف پوری طرح سرگرم عمل ہوگئے اور اسی وجہ سے رضاخاں کے غیظ وغضب کا نشانہ بن گئے۔ اگرچہ ڈاکٹر مصدق یورپ کے فارغ التحصیل تھے لیکن وہ قومی روایات اور ثقافتی قدروں کے زبردست پیرو تھے اور اسی وجہ سے انھیں ایرانی عوام کے درمیان بڑی مقبولیت حاصل تھی اور لوگ انھیں غیرمعمولی قدر واحترام کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔

ایرانی پارلیمنٹ کے سولہویں دور کی شروعات کے چند مہینوں کے بعد ڈاکٹر مصدق ''تیل کمیشن'' (Iranian Oil Commission) کے چیئرمین ہوگئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے تیل کو قومی ملکیت بنانے کا منصوبہ (Oil Nationalisation Plan) پیش کردیا۔ اس سے قبل چودھویں پارلیمنٹ کے دور میں وہ یہ قانون پاس کرواچکے تھے کہ ایرانی حکومت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر کسی غیرملکی یا ادارہ کو تیل کی صنعت کے سلسلے میں کسی قسم کی کوئی رعایت دے سکے۔ (۱۲) کیونکہ ڈاکٹر مصدق کا یہ خیال تھا کہ ''ایران برطانیہ تیل کمپنی درحقیقت سامراجیت کا مظہر تھی۔ (۱۳) لہٰذا جب تک ایران میں کسی مخصوص حکومتی اور غیرملکی کمپنی کو تیل کی تجارت کے سلسلے میں امتیازی اور خصوصی اختیارات حاصل رہیں گے تب تک اس ملک کی آزادی و استقلال کے لیے خطرہ بنا رہے گا اور ایران کی داخلہ سیاست پر غیرملکی طاقتوں کا اثر ورسوخ قائم رہے گا۔ واضح رہے کہ ایران-برطانیہ تیل کمپنی کی موجودگی برطانیہ کے لیے بنیادی مفاد کی حامل تھی۔ ایران کے سیاسی و اقتصادی ڈھانچے کی تشکیل میں اس کا اہم کردار ہوا کرتا تھا اور ایران کے خارجی و داخلی سیاسی روابط کی تشکیل میں بھی اس کمپنی کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور اسی کمپنی کے ذریعہ برطانیہ داخلی اور خارجی امور میں بھرپور مداخلت کیا کرتا تھا۔ اگر ایران کو حقیقی آزادی و خودمختاری کی تڑپ تھی تو اسے بہرحال اس غیرملکی اثر ورسوخ سے نجات حاصل کرنی تھی۔ (۱۴)

تیل کی تجارت کی قومیت کے اس منصوبے کی حمایت میں آیت اللہ کاشانی نے ایک مفصل اور مؤثر بیان جاری کرتے ہوئے اس سلسلے میں کی جانے والی جدوجہد کو "ملت اسلامیہ ایران کا مذہبی اور قومی فریضہ" قرار دیا۔ (۱۵) آیت اللہ کاشانی کے اس بیان کی پرزور حمایت میں دیگر مذہبی علماء اور مراجع تقلید نے بھی علیحدہ فتوے جاری کیے۔(۱۶) اور بقول خانم المتبون علماء و مذہبی رہنماؤں کی اس بھرپور تائید وحمایت کی وجہ سے ہی اس تحریک کو عمومی مقبولیت وغیر معمولی وسعت حاصل ہوگئی۔(۱۷)

بہرحال ایرانی پارلیمنٹ نے تیل کو قومی سرمایہ قرار دینے والے اس منصوبے کو منظوری دے دی اور اسی کے ساتھ ساتھ جلاً وصفت فوجی افسر رزم آرا کو ایران کا وزیر اعظم بھی بنادیا گیا۔ اس سے قبل رزم آرا ایرانی فوج کا سپہ سالار رہ چکا تھا۔ اس کی حتیٰ الامکان کوشش تھی کہ یہ منصوبہ پارلیمنٹ سے منظور نہ ہونے پائے بلکہ اس کی جگہ "معاہدہ گس گلشائیان" کو مجلس کی تائید حاصل ہوجائے لیکن آیت اللہ کاشانی نے رزم آرا کے خلاف ایک اعلانیہ بیان جاری کرتے ہوئے اس کو خارجی طاقتوں کا ایجنٹ قرار دیا۔(۱۸) اسی دوران رزم آرا کا قتل کردیا گیا اور اس طرح منصوبۂ تیل کی منظوری کی راہ میں موجود آخری رُکاوٹ بھی ختم ہوگئی اور اسی سال رزم آرا کے قتل کے آٹھویں دن پارلیمنٹ اور سینیٹ دونوں نے اس منصوبے کو منظوری دے دی اور اس تیل کی تجارت کو قومی ملکیت قرار دے دیا گیا اور ایرانی عوام کو ایک بڑی سیاسی کامیابی حاصل ہوگئی۔

دور مشروطہ سے رضا خاں کے مظالم تک

اس زمانہ میں جرمنی کی طاقتور حکومت کی زیادتیوں کے خلاف برطانیہ اور روس کے درمیان ایک معاہدہ ہوا اور ان دونوں ملکوں نے مسئلہ ایران کے ساتھ اپنے تمام باہمی اختلافات کو حل کرنا شروع کردیا۔ اس معاہدہ کے بعد برطانیہ نے جو، اب تک تحریک مشروطیت

کی حمایت کر رہا تھا، مشروطہ طلب جماعت کی طرفداری کرنا چھوڑ دی اور روس کو اس بات کی کھلی چھوٹ دے دی کہ وہ ایران کی نوتشکیل شدہ مشروطہ حکومت کا کام تمام کردے کیونکہ نظام مشروطیت روس کے آزادی طلب اور انقلاب پسند عناصر کے لیے امید کی روشن کرن اور حکومت روس کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ٹھیک اسی زمانہ میں ایرانی پارلیمنٹ کے بعض تندرو اراکین نے اپنی دہشت گردانہ حرکتوں کی وجہ سے محمد علی شاہ کو ایک مناسب بہانہ فراہم کردیا کہ وہ ظالم قزاق فوجی افسروں کی مدد سے ایرانی پارلیمنٹ پر بمباری کے ذریعہ اسے تباہ و برباد کر ڈالے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اس بمباری کے دوران کچھ اراکین مارے گئے، کچھ زخمی ہوئے اور کچھ گرفتار کرلیے گئے۔ دلچسپ اور غور طلب بات یہ ہے کہ دہشت گردانہ حرکتوں میں ملوث، شدت پسند اراکینِ پارلیمنٹ جو دوسروں کو حکومت کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے، اس بمباری کے دوران روپوش ہوگئے یا برطانوی سفارت خانہ کے اندر پناہ گزیں ہوگئے۔

غور طلب بات تو یہ ہے کہ انقلاب مشروطیت کی کامیابی اور پارلیمنٹ کی تشکیل کے کئی ماہ بعد بھی ایران کو امیدوں کے برعکس کوئی مفید عملی اقدام نظر نہ آیا بلکہ مسائل و مشکلات، بے سروسامانی و مفلوک الحالی نیز بدامنی اور عدم سلامتی میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کے عوام نے یہ بھی دیکھا کہ اراکینِ مجلس کے درمیان تفرقہ و اختلاف اور گروہ بندی کا بازار گرم ہے اور یہ لوگ عوامی فلاح و بہبود کے بجائے ذاتی مفاد و مصالح کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں اور اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ لہٰذا ایرانی عوام، پارلیمنٹ اور اس کے اراکین سے پوری طرح نا امید اور بے تعلق ہوگئے۔ چنانچہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جب شاہی فوج نے پارلیمنٹ پر حملہ کیا تو ایرانی عوام کی طرف سے کوئی ردِعمل دکھائی نہ پڑا۔ یہ بات صرف تہران تک محدود نہ تھی بلکہ ایران کے دیگر شہروں میں بھی کسی نے کوئی احتجاج نہ کیا۔

شاہ، شاہی دربار کے اعلیٰ حکام اور انقلاب مشروطیت کے مخالفین اس لڑائی میں ایک فاتح کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آگئے اور ان لوگوں نے مشروطہ طلب افراد کے خلاف ظلم و

نا انصافی کا بازار گرم کردیا اور ایرانی عوام کی عزت و آبرو بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ ان نام نہاد فاتحین نے ایرانی عوام پر بڑے مظالم ڈھائے۔ جب لوگوں کو یہ اندازہ ہوگیا کہ ان کی عزت و آبرو اور ملکیت و زندگی ان مٹھی بھر لوگوں کے ہاتھ کھلونہ بن چکی ہے تو انھوں نے دفاعی کاروائی شروع کی۔ تبریز میں ستارخان اور باقر خان نے ظالم شاہی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے لوگوں سے یہ اپیل کی کہ وہ حکومت کی ظالمانہ راہ و روش کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ عوام نے ان کی اس احتجاجی اپیل کا پرجوش استقبال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر احتجاجی جماعت کے ہاتھوں میں آ گیا۔ شاہ نے تبریزی عوام کی اس انقلابی تحریک کو کچلنے کے لیے ایک بڑا فوجی دستہ روانہ کیا کیونکہ اسے ڈر یہ تھا کہ حکومت کے خلاف بغاوت کی یہ آگ ایران کے دوسرے شہروں میں بھی بھڑک سکتی ہے۔ تبریز کے لوگوں نے اس ظالم شاہی فوجی دستہ کا بھرپور مقابلہ کیا جس کی وجہ سے حکومت اس احتجاجی تحریک پر غلبہ حاصل نہ کرسکی۔ دوسری طرف علمائے عراق (مثلاً آخوند خراسانی، مازندرانی اور تہرانی) اپنے جوشیلے بیانات اور انقلابی پیغامات کے ذریعہ لوگوں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ شاہی مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ ان علماء کی نظر میں ظالم شاہی حکومت کا مقابلہ کرنا امامِ زمانہ (عج) کے ہمراہ دشمنانِ خدا کے خلاف جہاد کرنا ہے۔ (۱۹) مذہبی علماء کے ان بیانات اور مذہبی احکامات نے انقلابی عوام کے حوصلوں میں غیر معمولی اضافہ کردیا چنانچہ وہ حکومت کے خلاف اپنی انقلابی سرگرمیوں میں لگے رہے۔ جیسے جیسے ایران کے دوسرے شہروں میں انقلاب تبریز کی خبر پہنچی اور لوگوں کو علمائے عراق کے انقلابی پیغامات کا علم ہوا، وہ لوگ بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ حکومت کے خلاف صف آرا ہونے لگے۔

برطانیہ اور روس کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ تھا کہ موجودہ صورتحال پر قابو پانا ایرانی حکومت کے بس کی بات نہیں ہے۔ لہٰذا ان دونوں ملکوں نے مختلف پہلوؤں سے کام کرنا شروع کردیا۔ ان لوگوں نے ایک طرف تو شاہِ ایران کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انقلاب مشروطیت کو تسلیم کرلے۔ دوسری طرف ایک دھمکی آمیز مشترکہ بیان جاری کرتے ہوئے مشروطیت طلب

علماء سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اپنی انقلابی سرگرمیوں سے باز آ جائیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ روسی فوج شہر تبریز کے اندر داخل ہوگئی اور شہر کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔

لیکن علماء بالخصوص آخوند خراسانی نے ان دھمکیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ مجاہدین تبریز کی حمایت کرنے کے لیے ایک جماعت کے ساتھ تبریز پہنچ کر انقلابی عوام کی قیادت و رہنمائی کریں۔ چنانچہ یہ علماء دسیوں ہزار مسلح اور غیر مسلح عراقی عوام بالخصوص اہلِ نجف کے ہمراہ ایران کی طرف روانہ ہوگئے۔ جیسے ہی برطانیہ اور روس کو علماء عراق کے اس شدید ردِّ عمل کی خبر ملی تو ان لوگوں نے گیلان اور بختیاری کے دو نامور لوگوں کو جو درحقیقت ان بیرونی ممالک کے ایجنٹ تھے، اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ انقلاب مشروطیت کا پرچم لیے ہوئے آگے قدم بڑھائیں اور ایرانی عوام کی اس انقلابی تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لیں اور شمال وجنوب کے راستہ سے تہران پر قبضہ کرلیں۔

ادھر عراقی علماء ہزاروں مسلح وغیرمسلح افراد کے ہمراہ نجف سے کربلا پہنچ چکے تھے۔ جیسے ہی انھیں کربلا میں فتح تہران کی اطلاع حاصل ہوئی انھوں نے سفر تہران کا ارادہ ترک کردیا اور سب لوگ نجف واپس چلے گئے اور فاتحین نے اقتدار کو آپس میں اس طرح تقسیم کرلیا کہ روسی اور برطانوی ایجنٹوں کے درمیان توازن برقرار رہے۔ ”مجاہد“ کے لقب سے مشہور ان حکمرانوں نے سب سے پہلے انقلاب مشروطیت کے مخالفین کی گرفتاری کا سلسلہ شروع کیا جس میں شیخ فضل اللہ نوری بھی شامل تھے۔ شیخ فضل اللہ نوری کو ایک ایسے عالم نما قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا جو فری میسن نامی برطانوی تنظیم سے وابستہ تھا۔ اس قاضی نے انھیں پھانسی کی سزا سنائی اور ۱۳ رجب ۱۳۲۷ ہجری یعنی یومِ ولادت حضرت علی علیہ السلام کے موقع پر تہران میں واقع توپخانہ گراؤنڈ پر انھیں پھانسی دے دی گئی تا کہ ایرانی عوام آئندہ ان کی برسی کے سلسلے میں مجلس سوگ وعزا کا اہتمام نہ کرسکیں۔ دوسری طرف مظفر الدین شاہ کے ظالم صدر اعظم عین الدولہ کو، جو انقلاب مشروطیت کا سخت مخالف تھا اور اکثر مجاہدین انقلاب کا قاتل بھی تھا،

فاتح حکام اور افسروں کے سامنے پیش کیا گیا اور ان لوگوں نے اسے نہ صرف معافی دے دی بلکہ اس کے ساتھ ایک یادگاری تصویر بھی کھنچوائی گئی۔

الحاج شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت سے ایرانی عوام بالخصوص علمائے دین بہت متاثر ہوئے اور پورے ملک میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ شیخ فضل اللہ نہ صرف یہ کہ تہران کے ایک نامور عالم دین تھے بلکہ شاہی حکومت کے خلاف تحریک تمباکو میں انھوں نے نمایاں خدمات بھی انجام دی تھیں۔ وہ تحریک مشروطیت کے آغاز سے پارلیمنٹ کی تشکیل تک اور اس کے بعد مجوزہ آئین کے سلسلے میں ہونے والے مباحثہ کے دوران دیگر علمائے دین کے ساتھ رہے۔ اس کے علاوہ ایک نمایاں مجتہد کی حیثیت سے وہ اپنے حق وفریضہ سے بخوبی واقف تھے اور اپنی اجتہادی صلاحیت کی بنیاد پر ہی انھوں نے مجوزہ آئین کی غیر معمولی اسلامی دفعات کی مخالفت کی تھی اور اسے ''بدعت'' کہا تھا۔

بہرحال شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے سب سے پہلے علماء عراق کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا کیونکہ یہ شہادت درحقیقت علمائے دین کی بے حرمتی کا پیغام تھی۔ اس کے علاوہ نجف اشرف میں ایسے علمائے دین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی جو شیخ فضل اللہ کے ہم خیال تھے۔ ان لوگوں میں اس دور کے مرجع تقلید سید کاظم یزدی بھی شامل تھے جو بنیادی طور پر سیاست میں مداخلت کرنے سے پرہیز کیا کرتے تھے اور ایران وعراق دونوں میں ان کے مقلدین و معتقدین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

واضح رہے کہ ابتدائی مرحلہ میں مشروطیت اور اس کے طرفداروں کے سلسلے میں علمائے عراق کے درمیان بڑی بدگمانیاں موجود تھیں۔ چنانچہ شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت نے علمائے دین کی بدگمانی کو یقین میں تبدیل کردیا اور لوگوں کو ایک عمدہ دلیل مل گئی۔ دوسری طرف عراق کے جن مشروطہ طلب علماء نے شیخ کی شہادت پر سکوت وشرمندگی کا رویہ اختیار کیا، ان سے سوالات کی بھرمار ہوگئی اور بالآخر انھیں گوشہ نشین ہونا پڑا۔ دوسری طرف ایران سے حاصل

شدہ اطلاعات سے یہ پتہ بھی چل رہا تھا کہ حقیقی مشروطہ طلب افراد کو طرح طرح سے پریشان کیا جارہا ہے اور ان کی جان وعزت و آبرو خطرہ میں ہے۔

الحاج شیخ فضل اللہ نوری کی شہادت کے تقریباً ایک سال بعد تہران کے دوسرے اہم مشروطیت طلب عالم دین سیّد عبداللہ بہبانی کو ایک قاتلانہ حملے کے دوران شہید کردیا گیا اور یہ پتہ چلا کہ اس قتل میں ایرانی پارلیمنٹ کا ایک ایسا ممبر ملوث تھا جو انقلاب مشروطیت سے قبل اپنی دین مخالف حرکتوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس خبر نے مشروطہ کے نئے ارباب اقتدار کے سلسلے میں علمائے دین کی بدگمانیوں میں اور اضافہ کردیا۔ چنانچہ ایران کے نائب السلطنت کے نام ایک ٹیلی گرام میں آخوند خراسانی اور عبداللہ مازندرانی نے "بڑے قومی لیڈران اور دین پرست مجاہدین" کی جدوجہد کے سلسلے میں شکریہ ادا کرتے ہوئے حکومت و پارلیمنٹ میں موجود مخرب و فاسد عناصر کی موجودگی، ان کی مغرب پرستی اور اسلامی اصول وقوانین کے سلسلے میں ان لوگوں کی لاپرواہی پر اپنی ناراضگی و پریشانی کا اظہار بھی کیا۔

مجموعی طور پر ان اسباب وعوامل نے عراق میں ایسی صورتحال پیدا کردی کہ مشروطیت طلب علماء کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی اور نوبت یہ آگئی کہ نجف اشرف میں بھی جو شیعہ علماء کی قدیم چھاؤنی اور مشروطہ طلب علماء کے اہم اور قسمت ساز فیصلوں کا مرکز تھا، علماء دین کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ نہ تھی۔ طلباء اور عوام، جو بالعموم مشروطیت کے مخالف تھے اور جن کو صحیح اطلاع بھی نہیں ہوا کرتی تھی، مشروطہ طلب علماء کے خلاف تہمت لگانے سے باز نہیں آتے تھے اور یہ لوگ آخوند خراسانی جیسے نامور عالم دین پر بھی الزام عائد کرنے میں ذرہ برابر ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب روس اور برطانیہ کی فوجوں نے شمال وجنوب سے ایران پر قبضہ کرلیا۔ (۱۳۲۹ھ) شہر تبریز میں روسی افواج نے مشروطہ طلب عناصر کا قتل عام شروع کردیا اور مقتولین میں ثقۃ الاسلام تبریزی جیسے صاحب عظمت عالم دین بھی موجود تھے۔ عراق پر بیرونی

افواج کے قبضہ کی خبر سے علمائے عراق کے درمیان ایک بار پھر ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اپنی ناراضگی کے باوجود ان لوگوں نے تہران جانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ ایرانی عوام کی مدد سے غاصب فوج کو ملک کے باہر نکال سکیں اور انقلاب مشروطیت کے سایہ میں جن لوگوں نے اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے رکھی ہے، ان پر بھی نگاہ رکھ سکیں۔ عراق کے ہزاروں مسلح اور غیر مسلح افراد اور قبائل نے علمائے نجف و کربلا کی اطاعت میں ایران جانے کا فیصلہ کرلیا۔ سیّد کاظم یزدی اگرچہ عراق سے باہر تو نہیں نکلے لیکن انھوں نے اپنے ایک بیان میں ایران پر روسی اور برطانوی فوجی حملے کی سخت مذمت کی۔ علمائے نجف کا یہ قافلہ ایران کی طرف روانہ ہونے کے لیے پوری طرح آمادہ تھا لیکن جس روز اس قافلے کی روانگی تھی اسی دن صبح کے وقت مشکوک حالات میں آخوند خراسانی کی موت واقع ہوگئی۔

اگرچہ خراسانی کی موت کی وجہ سے دیگر علماء کے فیصلے میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا اور وہ لوگ کاظمین کی طرف روانہ ہوگئے لیکن آخوند جیسی نمایاں شخصیت کے فقدان نیز ایرانی علماء اور حکمرانوں کی طرف سے ملنے والی مختلف اطلاعات کی وجہ سے لوگ اپنے سفر ایران کو جاری نہ رکھ سکے اور اس طرح ایران کے سیاسی واقعات میں علماء کی براہِ راست مداخلت اور مشروطیت کی صحیح قیادت کا دوسرا موقع بھی ہاتھ سے چلا گیا۔ ویسے تحریک مشروطیت میں اس دور کے مذہبی علماء سے اتنے عظیم کام کی امید بھی نہ کرنی چاہیے تھی کیونکہ ان لوگوں نے قدیم مذہبی روایات کے سایہ میں تعلیم حاصل کی تھی اور طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی مذہبی مصروفیات بالکل روایتی انداز کی تھیں اور وہ اپنی روایتی مصروفیتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اپنے فرائض کو انجام دیا کرتے تھے لہٰذا یہ بات ان روایتی علماء کے لیے کسی حد تک دشوار معلوم ہوتی تھی کہ مغرب سے تعلقات کے نتیجے میں ایران میں جو مسائل پیدا ہوگئے تھے انھیں وہ لوگ بخوبی سمجھ سکیں۔

سیاسی میدان سے علماء اور مذہبی رہنماؤں کی علیحدگی کی وجہ سے مغرب پرست اور

نام نہاد مشروطہ طلب افراد نے ملک و ملت کو اپنی ذاتی ہوس اور سامراجی طاقتوں کی مفاد پرست خواہشات کا شکار بنانا شروع کردیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ ستارخان جیسے حقیقی مشروطہ خواہ شخص کے وجود کو بھی تحمل نہ کرسکے اور فقط ستارخان ہی نہیں بلکہ ان کے ساتھیوں کے خلاف شرمناک پروپیگنڈوں کا بازار گرم کردیا تاکہ عوام کے درمیان ان کا کوئی اثر و رسوخ باقی نہ رہ جائے۔ سماج میں اچھی طرح بدنام کرنے کے بعد ان لوگوں نے ستارخان پر بھی قاتلانہ حملہ کردیا اور اس حملے کی وجہ سے وہ ایک مدت تک بستر علالت پر پڑے رہے اور بعد میں انتہائی غم انگیز حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اس طرح ایرانی عوام کی عدالت پسندانہ تحریک میں بنیادی کردار ادا کرنے والی مذہبی اور قومی شخصیتیں دھیرے دھیرے اس تحریک سے کنارہ کش ہوگئیں، جسکے نتیجے میں انقلاب دشمن افراد و عناصر نے اس انقلاب پر غلبہ حاصل کرلیا۔ پس یہ بات قطعی حیرت انگیز نہیں ہے کہ انقلاب مشروطیت کی کامیابی سے قبل مظفرالدین شاہ کا صدر اعظم عین الدولہ جو مشروطہ طلب لوگوں کا جانی دشمن تھا اور جس نے محاصرہ تبریز کے دوران بیرونی فوجوں کا اعلانیہ ساتھ دیا تھا، دس سال کا وقفہ گزرنے کے بعد مجلس شوریٰ ملی یعنی پارلیمنٹ کے ذریعہ دوبارہ صدر مملکت کا عہدہ حاصل کرلیتا ہے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ انقلابی جوش وخروش میں کمی آتی چلی گئی اور دھیرے دھیرے ملک میں سیاسی گڑبڑی، سماجی اختلافات اور اقتصادی مفلوک الحالی میں غیر معمولی اضافہ ہوتا رہا۔ ملک کی اقتصادی حالت میں اصلاح و سدھار کے بجائے اور زیادہ خرابی پیدا ہوگئی۔ ملک کے اکثر صوبوں میں علاقائی بغاوت شروع ہوگئی اور صوبائی حکام نے مرکزی حکومت سے علیحدگی اختیار کرنا شروع کردیا اور معاشرہ میں امن وسلامتی نام کی کوئی چیز باقی نہ رہ گئی۔ روس اور برطانیہ نے بھی پورے ایران میں پھیلی ہوئی گڑبڑی و مفلوک الحالی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے ملک وملت پر اپنے ناجائز اثر ورسوخ میں غیر معمولی اضافہ کرنا شروع کردیا۔

اسی زمانہ میں پہلی جنگ چھڑ گئی۔ درحقیقت یہ جنگ ایرانی عوام کے سر پر بجلی کی

طرح گر پڑی اور ان کی مصیبتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ حکومت ایران میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ ملک کے سیاسی استقلال کی حفاظت کر سکے۔ اگر چہ ایک مدت کے بعد اس حکومت نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن جنگ میں سرگرم روسی، برطانوی اور عثمانی حکومتوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور اپنی فوجیں ایران میں داخل کر دیں اور ایک دوسرے کے خلاف جنگی کاروائی میں مشغول ہوگئے۔ ملک کے ماہرین سیاست اور قوم پرست افراد کے سامنے فقط یہی ایک راستہ باقی رہ گیا تھا کہ وہ تہران سے ہجرت کر کے ملک کے مغربی حصہ میں چلے جائیں اور ایک عارضی حکومت کی تشکیل کر کے جرمنی اور ترکی کے ساتھ تعاون کا اعلان کر دیں لیکن ان لوگوں کی اس سیاسی تحریک سے بھی ایرانی عوام کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس عالمی جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہوا ہو لیکن ایرانی عوام کو ویرانی و مفلوک الحالی کے علاوہ کچھ نہ ملا اور اس ملک میں ہر طرف قحط، بھوک اور بیماری کا بول بالا ہوگیا۔ اس کے علاوہ مقامی گڑبڑی نیز ملک کے ہر گوشہ میں بیرونی فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے استقلال و آزادی کا بظاہر خاتمہ ہو چکا تھا۔

پہلی جنگ عظیم کے آخری زمانہ میں روس میں انقلاب رونما ہوا اور متعدد داخلی و خارجی مسائل و مشکلات نیز ملک میں رونما ہونے والی جدید صورتحال کی وجہ سے روس میں اب اتنا دم نہ رہ گیا تھا کہ وہ پہلے کی طرح ایران کے معاملات میں مداخلت کرے لیکن یہ تاریخی اور سنہری موقع بھی ایرانی حکومت اور عوام کے حق میں مفید و کارآمد ثابت نہ ہوا کیونکہ برطانوی فوجوں نے فوری طور پر پورے ملک پر اپنا فوجی اور سیاسی تسلط قائم کر لیا۔ ان لوگوں نے روس کی نئی حکومت کی نابودی و سرنگونی کے لیے دو ہتھکنڈے ایک ساتھ استعمال کیے۔ پہلے ایران میں تعینات روسی فوج کو جو بالعموم سابقہ حکومت کی طرفدار تھی، اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے روس کی موجودہ عوامی اور انقلابی فوج کے مقابلے کے لیے بھیج دیا اور دوسرے مرحلے میں ایران کی نام نہاد کمیونسٹ تنظیموں کی تشکیل کر کے انھیں روس کی سیاسی اور فوجی تنظیموں کے اندر رخنہ اندازی کے لیے مقرر کر دیا۔

ایسی صورت حال میں برطانیہ نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ ایران میں اپنی پسندیدہ حکومت قائم کر کے ایران میں اپنی فوجی اور سیاسی موجودگی کو قانونی حیثیت عطا کرے۔لہٰذا ۱۹۱۷ء میں ایران میں وثوق الدولہ کی کابینہ کی تشکیل عمل میں آئی۔ وہ مشروطیت طلب افراد کی نظر میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، آزادی پسند اور صاحب مہارت سیاست داں سمجھا جاتا تھا۔ اس کابینہ کی تشکیل کے ایک سال بعد حکومت برطانیہ نے وثوق الدولہ کے ساتھ ایک معاہدہ پر دستخط کیے جس کو ''معاہدہ ۱۹۱۹'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے بموجب فوجی اور مالی سسٹم سے متعلق جملہ امور برطانوی مشیروں کے سپرد کردیئے گئے تھے۔ بہ لفظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس معاہدہ نے ایران کو برطانوی نوآبادیاتی نظام کا حصہ بنادیا گیا۔

چنانچہ داخلی اور خارجی سطح پر اس معاہدہ کی بھرپور مخالفت ہوئی۔ ملک کے اندر بعض اراکینِ پارلیمنٹ مثلاً سید حسن مدرّس جیسے لوگوں نے کافی بڑے پیمانے پر ایرانی کابینہ کو بے نقاب کرنا شروع کردیا۔ ملک کے غیر معمولی جانبدار اور برطانیہ مخالف اخباروں اور رسالوں نے اس شرمناک معاہدہ کی وجہ سے وثوق الدولہ کا خوب مذاق اُڑایا۔ آذربائیجان میں شیخ محمد خیابانی اور گیلان میں میرزا کوچک خان جنگلی نے اس معاہدہ کے خلاف انقلاب برپا کردیا۔ حکومت نے مخالف افراد کی گرفتاری اور مخالف اخباروں و رسالوں پر سخت پابندی لگادی پھر بھی معاہدہ کے خلاف عوامی احتجاج میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بیرونی سطح پر برطانیہ سے سامراجی رقابت رکھنے والے ممالک مثلاً روس، امریکہ اور فرانس نے اس معاہدہ کی زوردار مخالفت کی اور نو تشکیل شدہ ''اقوامِ متحدہ'' نے بھی سرکاری طور پر اس معاہدہ کو تسلیم نہ کیا۔

وسیع اور شدید اختلافات اور مخالفتوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے وثوق الدولہ نے معاہدہ کی عملی تعمیل کو روک دیا اور لازمی منظوری کے لیے اسے مجلس یعنی پارلیمنٹ کے سپرد کردیا۔ تیرہ سال بعد رونما ہونے والے اس واقعہ سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ ایسے بحرانی حالات میں ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والے فاسد و خائن حکمرانوں نے تحریک مشروطیت کو کس حد تک منحرف کردیا تھا۔

بہرحال وثوق الدولہ کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار باقی نہ رہ گیا تھا کہ حکومت سے مستعفی ہوجائے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مشیر الدولہ نامی شخص، جو سماج میں نیک نام مگر نہایت مصلحت اندیش تھا، اس کا جانشین مقرر ہوا لیکن ملک کے مسائل کا حل تلاش کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی لہٰذا قبل اس کے کہ مشکلات اس پر غالب ہوجائیں اس نے خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ واضح رہے کہ انقلاب مشروطیت کے بعد قومی رہنماؤں کی نظر بحرانی اور حساس سیاسی ماحول میں ''استعفیٰ'' ایک بہترین حل تھا کیونکہ ان لوگوں کو ملکی مفاد و مصالح کے مقابلے میں اپنی ذاتی شخصیت وشان وشوکت زیادہ عزیز تھی، اسی وجہ سے جب کبھی انھیں اپنی حیثیت خطرہ میں نظر آتی، وہ فوری طور پر استعفیٰ دے دیا کرتے تھے۔ مشیر الدولہ کے مستعفی ہونے کے بعد کمانڈر جنرل فتح اللہ خان تنکابنی نے صدارت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی لیکن اس میں بھی اتنی صلاحیت نہ تھی کہ ملک کے مسائل حل کرسکے۔

عالمی جنگ کے خاتمہ کے دو سال بعد نیز ملک سے روسی فوجوں کے نکل جانے کے بعد لوگوں نے امید لگا رکھی تھی کہ اب مفلوک الحال و بے سروسامانی، فقر وگرسنگی اور تباہی و بربادی کا دور ختم ہوجائے گا لیکن مسند اقتدار پر ایران والے حاکموں میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ ایرانی عوام کی امیدوں کو پورا کرسکیں۔ یہی وجہ تھی کہ فقط عوام ہی نہیں بلکہ ایران کے سیاسی ماہرین بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ ملک کی فلاح و بہبود ان حکمرانوں کی صلاحیت سے باہر ہے لہٰذا سبھی لوگ کسی ایسے حادثہ کا انتظار کر رہے تھے جو موجودہ صورت حال کو دگرگوں بنا دے۔ مختصر لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ ماہرین سیاست کو فوجی بغاوت اور عوام کو نجات وسلامتی کی فکر دامنگیر تھی۔

○○

حوالے:

۱۔ محمد علی کاتوزیان: اقتصاد سیاسی ایران وسلطنت محمد رضا شاہ، تہران، وپیرس، ص ۱۱

۲۔ حسین دوست: ظہور وسقوط سلطنت پہلوی، جلد ۱، ص ۱۰۲ و ۱۰۳

۳۔ ظہور وسقوط، جلد ۲، ص ۳۸

۴۔ گزشتہ چراغ راہ آئندہ، ص ۸۴ و ۸۵

۵۔ مقالات تقی زادہ، جلد ۵
۶۔ محمد علی کاتوزیان: اقتصادِ سیاسی ایران۔ ص ۱۱ و ۱۳
۷۔ اس دور میں بعض افراد کی نظر میں عمومی تصفیہ و پاکسازی لازمی نہ تھی۔ چنانچہ عدم تصفیہ عمومی کو ایرانی عوام کی کینہ پروری سے تعبیر کیا جاتا ہے، جو قطعی درست نہیں ہے۔ اسلامی انقلاب کی کامیابی سے قبل ایران میں کوئی حقیقی قومی حکومت تشکیل نہیں ہوئی تھی اسی وجہ سے اس دور کے ظالموں اور خیانت کاروں کے خلاف کوئی اہم اور مؤثر قدم نہیں اُٹھایا گیا تھا لیکن اسلامی انقلاب کی کامیابی اور ایران میں اسلامی حکومت کی تشکیل کے بعد انقلابی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا اور سابقہ حکومت کے ظالموں کو لازمی سزائیں دی گئیں اور ایرانی عوام نے اس کا بھرپور استقبال بھی کیا۔
۸۔ روحانیت وبہضت ملّی شدن صنعت نفت۔ ص ۲
۹۔ احسان طبری، کژراہہ۔ حسین فردوست، ص ۱۴ تا ۱۴۳
۱۰۔ عبدالرحیم ذاکر حسین، مطبوعات سیاسی درعصر مشروطیت۔ ص ۱۷۳
۱۱۔ آیت اللہ کاشانی کی حیات اور کارناموں کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے رجوع کیجئے۔ روحانیت شدن صنعت نفت۔
۱۲۔ آیت اللہ کاشانی کی حیات اور کارناموں کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے رجوع کیجئے۔ روحانیت شدن صنعت نفت۔
۱۳۔ رونالڈ فری: اختلافات ایران وانگلیس۔ ص ۲۹۷
۱۴۔ محمد علی کاتوزیان۔ ص ۳۲
۱۵۔ روحانیت وبہضت ملّی شدن صنعت نفت۔ ص ۵۴-۵۵
۱۶۔ آیت اللہ کاشانی کی حمایت میں فتوے صادر کرنے والوں میں آیت اللہ خوانساری، آیت اللہ کلباسی، آیت اللہ محلاتی اور آیت اللہ شاہرودی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ رجوع کیجئے: روحانیت وبہضت ملی شدن صنعت نفت۔
۱۷۔ ان کا بیان ہے کہ جب تک مذہبی علماء نے اسلامی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ تحریک کی حمایت نہیں کی تھی اس کو عوامی مقبولیت کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ بحوالہ رونالڈ فری۔ اختلافات ایران وانگلیس۔
۱۸۔ روحانیت وملّی شدن صنعت نفت۔ ص ۱۱
۱۹۔ احمد کسروی، تاریخ مشروطہ۔ ص ۷۳۰
۲۰۔ دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی، ص ۱۵۱ و ۱۵۲۔ ''آخوند خراسانی''